راہِ حق کے مہلک خطرے

(جن کی طرف سے ہر اسلامی تحریک کو ہمیشہ ہوشیار رہنا ضروری ہے)

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

کوئی بیس برس پہلے ماہ نامہ زندگی کے لیے میں نے ایک مضمون لکھا تھا، جو تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ چوں کہ اس کی اصل حیثیت کسی نظری یا علمی بحث کی نہ تھی، بل کہ ایک تذکیرو تنبیہ کی تھی اور اسے تحریکِ اسلامی کی ایک اہم ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا۔ اس لیے برابر یہ خیال رہا کہ اسے کتابی شکل دے دی جائے، تاکہ اس کی افادیت زیادہ عام ہو سکے، مگر اس میں تاخیر پر تاخیر ہوتی گئی، اور اب جا کر یہ توفیق مل سکی ہے کہ اس خیال کو عمل کا جامہ پہنایا جا سکے۔ چناں چہ ضروری اصلاح و ترمیم کے بعد اس مضمون کو آج اس کتاب کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اگر چہ یہ ایک مختصر کتاب ہے، مگر جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا، اپنے موضوع اور مدّعا کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ امید ہے کہ دین کی نصرت و اقامت کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا، اور وہ اسے اپنی ایک ضرورت کی چیز پائیں گے۔

صدرالدین اصلاحی

۳۱/اکتوبر ۱۹۷۷

راہِ حق کے مہلک خطرے

ایک اصولی حقیقت، ایک دائمی تنبیہ

دنیا میں جب بھی کوئی تحریک فاتحانہ شان سے آگے بڑھی ہے تو صرف اس لیے بڑھی ہے کہ وہ عوامل اس کے ہم رکاب تھے جو اس جیسی تحریکوں کی زندگی اور توانائی کے ضامن ہوا کرتے ہیں اور اگر اس کے قدم کہیں رُک گئے ہیں، یا کسی منزل پر پہنچ چکنے کے بعد وہ پھر سے بے منزل ہوگئی ہے، تو ایسا اسی وقت ہوا ہے جب ان عوامل کی ہم رکابی سے اس نے اپنے آپ کو محروم کرلیا، اور ان کی بجائے کچھ دوسری نوعیت کے عوامل کے ہاتھوں میں اپنی باگ دے دی، ایسے عوامل کے ہاتھوں میں جو اُسے صرف ناتوانی، انتشار اور سکوتِ مرگ ہی دے سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس سے دعوتوں اور تحریکوں کی پوری تاریخ میں، خواہ وہ حق دعوتوں کی تاریخ ہو، خواہ باطل دعوتوں کی، کسی استثناء کا ثبوت نہیں ملتا، اور عقلِ عام کہتی ہے کہ ملنا بھی نہیں چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک مطلق، ہمہ گیر اور دائمی کلّیہ ہے۔ اور اس بات کا ہرگز کوئی امکان نہیں کہ آج یا آئندہ کوئی تحریک اس سے مستثنیٰ ہوسکے گی۔ اس لیے جس تحریک کو بھی اپنی کشتی ساحلِ مراد تک پہنچانی ہو اس کو اِس کلّیہ کی حکمرانی پورے شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرنی پڑے گی۔ ورنہ پھر اسے اُس انجام کے لیے تیار رہنا ہوگا جو قدرت کے اٹل ضوابط سے بغاوت کرنے کا ہوا کرتا ہے۔ کسی دعوت کی حقانیت اور جاذبیت بھی اسے اس انجام سے نہیں بچاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق کی اقامت کے لیے مبعوث اور مامور کیا گیا تو

آپ ؐ پر اور آپ ؐ کے ساتھیوں ؓ پر یہ حقیقت اچھی طرح کھول دی گئی تھی، اور پھر وقفہ وقفہ سے انھیں اس کی مسلسل یاددہانی بھی کرائی جاتی رہی۔ انھیں صراحت سے بتادیا گیا کہ فلاں فلاں باتوں کا تمھارے اندر پایا جانا اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قطعاً ناگزیر ہے، اور فلاں فلاں چیزیں ایسی ہیں جو تمھارے اندر اگر پیدا ہوگئیں تو تمھارا نامراد ہوجانا لازمی ہے۔ پھر اس اصولی تلقین ہی پر اکتفانہیں کرلیا گیا، بل کہ ساتھ ہی ان کے سامنے پچھلی امتوں اور دعوتوں کی تاریخِ عروج وزوال بھی کھول کر رکھ دی گئی، جو گویا واقعات کی زبان سے ان حقائق کی شہادت پر شہادت دیتی جاتی تھی۔ خصوصاً پیش رَو امّت، یعنی بنی اسرائیل، کی ملّی داستان تو اتنی تفصیل سے بیان کی گئی، اور اتنی بار بیان کی گئی، کہ وہ تمام عوامل ایک ایک کرکے اُبھر کر سامنے آگئے، جنھوں نے اس ملّت کو ڈبویا تھا، اور جو یہ ڈراوا دے رہے تھے کہ جب بھی کوئی ملّت اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرے گی ہم اُسے ڈبو کر ہی دم لیں گے۔ اس طرح پچھلی امتوں کی یہ سرگزشتیں، جنھیں قرآنِ حکیم نے اتنے اہتمام سے اپنے سینے میں قیامت تک کے لیے محفوظ کردیا ہے۔ امّتِ مسلمہ کے لیے دراصل ایک ''نذیرمبین'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ چناں چہ اس نے جہاں ایک طرف اپنے پیرؤوں کو پچھلی دعوتوں اور امتوں کی یہ عبرت ناک سرگزشتیں سنائی ہیں وہاں دوسری طرف انھیں یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ دیکھنا:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (حشر:۱۹)

''ان لوگوں جیسے نہ بن جانا جنھوں نے اللہ کو بھلادیا تو اس نے انھیں (خود) اپنے آپ سے غافل کردیا۔''

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (آل عمران:۱۰۵)

''ان لوگوں کا سارویہ اختیار نہ کرنا جو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) واضح ہدایات آچکنے کے بعد بھی ٹولیوں میں بَٹ گئے اور باہمی اختلاف کا شکار ہورہے۔''

ظاہر ہے، اس امّت کی خوش بختی اس میں تھی کہ وہ اس وصیتِ خداوندی کو دانتوں سے پکڑے رہتی اور اس تنبیہ قرآن کا پورا پورا حق ادا کرتی رہتی۔ چناں چہ ساری دنیا جانتی ہے کہ

جب تک اس نے یہ حق ادا کیا بخت واقبال اس کے قدم لیتے رہے اور اسلام کی دعوت دلوں اور جسموں کو مسخر کرتی چلی گئی۔ مگر جب آگے چل کر اس نے اس ہدایت اور تنبیہ کی طرف سے اپنے کان بند کرنے شروع کر دیے، اور انھی راستوں پر چل پڑی جن پر چلنے سے اُسے بار بار منع کیا جا چکا تھا، تو پھر زوال اور ادبار کے اس حشر سے بھی نہ بچ سکی جو اس خود فراموشی اور فرض ناشناسی کا قدرتی نتیجہ تھا۔

قرآنِ حکیم کی یہ تنبیہ یقینی طور پر ایک اُصولی اور دائمی تنبیہ تھی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امت یا اس کا کوئی گروہ جب کبھی اپنے نصب العین کی طرف پلٹے تو اپنے سفر کے آغاز سے لے کر اپنی منزلِ مقصود پا لینے تک اور پھر منزل پا لینے کے بعد بھی، اس تنبیہ کو قرار واقعی عملی اہمیت دیے رہتے، اور ان عوامل پر برابر کڑی نظر رکھے، جن کے ہاتھوں میں ملتوں اور دعوتوں کی پھانسی کے پھندے لٹک رہے ہوں۔ اب تو اس کے لیے اِن عوامل کو ٹھیک ٹھیک پہچان لینا کہیں زیادہ سہل بھی ہو گیا ہے۔ کیوں کہ اس وقت اس کے سامنے صرف دوسری ہی ملتوں کے عروج و زوال کے واقعات اور اسباب نہیں ہیں، بل کہ خود اپنی آپ بیتی بھی موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جن اسبابِ زوال کا اس نے پہلے ''حدیثِ دیگراں'' کے اندر دور سے اور صرف نظری طور پر مشاہدہ کیا تھا انھیں اب وہ بالکل قریب سے دیکھ چکی ہے، اور ان کے بارے میں اپنا ذاتی تجربہ رکھتی ہے۔ اس لیے اگر وہ فکرمندی اور احساسِ فرض کے ساتھ اپنے گزشتہ افکار و کردار کا بے لاگ جائزہ لے کر دیکھے تو ایک ایک کر کے وہ تمام اسباب و عوامل از خود اس کے سامنے آ جائیں گے جنھوں نے اسے اور اس کے مشن کو موجودہ زبوں حالی تک پہنچا دیا ہے، اور جن کی گرفت سے آزاد ہوئے بغیر وہ اپنے فریضے کی ازسرِ نو بجا آوری کے کبھی قابل نہیں ہو سکتی۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس وقت اس فریضے کی ازسرِ نو بجا آوری کا کوئی اقدام اپنی نوعیت کا پہلا اقدام ہو۔ بہ خلاف اس کے درمیانی مدّت میں بھی اس امّت کے کتنے ہی صالح افراد اور سعید گروہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے متعدد اقدامات کر چکے اور احیائے دین کی مختلف تحریکیں اُٹھا اور چلا چکے ہیں۔ ان تحریکوں کے مفصل حالات ملت کی تاریخ میں نمایاں ابواب کی حیثیت سے پوری طرح محفوظ ہیں، ان کی روشنی میں آج کی کسی بھی اسلامی تحریک کے لیے اپنی

راہ کے نشانات زیادہ اچھی طرح دکھائی دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ آج جو بھی دینی تحریک اُٹھے گی وہ تاسیسِ دین کی تحریک نہ ہوگی بل کہ تجدید واحیائے دین کی تحریک ہوگی، اور ٹھیک یہی نوعیت اِن تحریکوں کی رہی ہے۔ نوعیت کی اس یکسانی کی بنا پر ان تحریکوں کی پوری سرگزشت کا مطالعہ اور تجزیہ آج کی کسی بھی اسلامی تحریک کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مطالعہ اس کے لیے یقیناً بعض ایسے اہم تحریکی نکات سامنے لاسکتا ہے جو مستقبل اور تاسیسی نوعیت کی دعوتوں کی سرگزشت میں نہ پائے جاسکیں گے۔

غرض آج کے اہلِ دعوت کو ضرورت جو کچھ ہے وہ صرف 'پرہیز' اور 'احتیاط' کے زندہ عزم واحساس کی ہے۔ ورنہ 'علاج' کا معاملہ ہو یا 'حفظانِ صحت' کا، یہاں ہر ایک کے لیے مجرب تدبیروں کا پورا سامان موجود ہے۔ دعوتِ حق کی طویل تاریخ ہر قسم کے دعوتی تجربات اور ہر طرح کی دعوتی سرگزشتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ دوسری امتوں کی سرگزشتیں بھی اور خود امتِ مسلمہ کی بھی، تاسیسی اور مستقل نوعیت کی دعوتوں کی بھی اور تجدیدی قسم کی تحریکوں کی بھی۔ اتنی ''آیات بیّنات'' کے ہوتے ہوئے بھی اگر آج کسی داعی گروہ پر یہ ضرورت واضح نہ ہوسکی اور اپنی دعوت کو متوقع خطرات سے بچائے رکھنے کی فکر نے اسے مضطرب نہ رکھا تو یہ فی الواقع اس کے عقلی دیوالیہ پن کا ثبوت ہوگا۔ اور ایسی حالت میں اسے ہرگز اس بات کا حق نہ ہوگا کہ اپنی دعوتی مہم کو کامیاب دیکھ سکے۔

اسلامی تحریک کو خود احتسابی کی ضرورت

یہ اصولی تنبیہ تحریک اسلامی ہند کے لیے بھی اتنی ہی زیادہ اہمیت کی مالک ہے جتنی کہ وہ دنیا کی کسی اور اسلامی تحریک کے لیے ہوسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک کا مستقبل بھی بہت کچھ اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنا سفر جاری رکھتے وقت بگاڑ، انتشار، اور زوال کے ان خطرناک عوامل کی طرف سے کہاں تک چوکنی رہتی ہے، جو ماضی کی کتنی ہی دعوتوں اور تحریکوں کو راستہ ہی میں چھاپہ مار کر ختم کر چکے ہیں اور کتنوں ہی کو منزل پر پہنچ چکنے کے بعد پھر سے بے منزل و بے راہ بنا چکے ہیں۔ اس تحریک نے امّت کے مختلف گروہوں کے افکار و اعمال کا گہرا تنقیدی

جائزہ لیا ہے، اور ان کے اندر جو بھی کوتاہیاں محسوس کی ہیں ان کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف صاف منظر عام پر رکھ دینے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا ہے۔ خصوصاً اُن فکری اور عملی کوتاہیوں کے بیان کرنے میں تو وہ بسا اوقات ''ذوقِ نغمہ'' کی کمی پا کر تلخ نوائی پر بھی مجبور ہوگئی ہے جنھوں نے امّت کو اس کے اصل مقام اور مشن سے دور پھینک دینے میں بنیادی کردار انجام دے رکھا ہے۔ کیوں کہ دعوتی اور دینی مصالح کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مگر اسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ تنقید اور احتساب کا فریضہ بس اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، بل کہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتا ہے۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ یہی 'بہت کچھ' وہ چیز ہے جسے فی الواقع اصل تنقید اور حقیقی احتساب سمجھنا چاہیے۔ اس سے مراد وہ تنقید ہے، جو خود اپنے پر کی جائے، اور وہ احتساب ہے جس کی خوردبینوں کا رُخ خود اپنے ہی افکار و اعمال کی طرف ہو۔ دوسروں کے افکار و اعمال کا تنقیدی جائزہ لینے کی واقعی ضرورت تو صرف کبھی کبھی پیش آسکتی ہے، مگر خود اپنے تنقیدی جائزے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ اس ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ آنکھیں برابر کھلی رکھی جائیں، اور پوری دیدہ ریزی کے ساتھ یہ دیکھتے رہا جائے کہ کہیں وہی کوتاہیاں —— دعوتِ حق کو سبوتاز کر دینے والے وہی خوف ناک عوامل —— خود ہمارے اندر بھی تو آ گھسنے کے لیے کوشاں نہیں ہیں جو ماضی میں نہ جانے کتنی ہی دینی تحریکوں کو موت کی نیند سلا چکے ہیں۔ اگر اس خود احتسابی کا اہتمام نہ رکھا گیا اور اس تحریک کے علم بردار اپنے کو اس ضرورت سے، خدانہ خواستہ، ماوراء سمجھ بیٹھے، اور کسی بے پروائی یا خام خیالی کے باعث اِن عوامل ہلاکت کی طرف سے بے فکر ہو رہے تو وہ دن دور نہ ہوگا جب وہ بھی عام امّت کی تاریخ دہرا رہے ہوں گے، جس کا مدّت سے حال یہ ہو چکا ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہوئے اس کی زبان سے عیسائیوں، یہودیوں اور دوسری گُم راہ و معتوب قوموں پر تو برابر نفریں کرتی اور ان کے افکار و اعمال پر لعنتیں بھیجتی رہتی ہے، لیکن ذرا نہیں دیکھتی کہ خود اس کا اپنا حال بھی کچھ مختلف نہیں رہ گیا ہے اور وہ خود بھی انھی کی سی خرابیوں اور معصیت کوشیوں میں لت پت ہو چکی ہے۔ ضرورت، شدید ضرورت ہے کہ آج جو لوگ وہ فرض ادا کرنے اُٹھے ہوں جس کے لیے یہ اُمّت وجود میں لائی گئی تھی، وہ اس خود را فضیحت دیگراں را نصیحت کی شرم ناک روش سے دُور رہیں۔ ورنہ ہوگا یہ کہ ایک طرف تو وہ

دوسروں کی غفلتوں اور کوتاہیوں کا شکوہ کرتے ہوں گے۔ دوسری طرف یہی عیوب خود ان کی قوّتِ ایمان وعمل کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہوں گے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا المیہ ظہور میں آئے۔ لیکن جو بات بار بار وجود میں آچکی ہو اس کا اب پھر وجود میں آ جانا ناممکن یا غیر متوقع تو نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا اس کے امکان کو ایک خطرناک امکان سمجھتے ہوئے وقت سے پہلے ہی، بل کہ اوّل روز ہی سے اس کے تدارک کی فکر میں رہنا چاہیے۔ یعنی دعوتِ حق کے دشمن عوامل کا انتظار کیے بغیر ان کے مقابلے کی تیاریاں پہلے ہی سے مکمل رکھنی چاہییں، اور 'سرحدوں' کی 'ناکہ بندی' میں کہیں بھی کوئی رخنہ باقی نہ رہنے دینا چاہیے۔

خود احتسابی کی بنیادی تدبیر

اس فکر و اہتمام اور پیش بندی کا حق، کم سے کم دعوت کے ابتدائی مراحل میں، اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ جماعت کا ہر فرد، خواہ اس کی پوزیشن جماعتی نظم اور ذاتی صلاحیت کے اعتبار سے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اپنے تحریکی فرائض میں فریضہ نمبر ایک نہ بنا لے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام افرادِ جماعت اس معاملہ میں برابر کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ نفسِ ذمہ داری میں شریک سبھی ہیں۔ منصب اور علم و بصیرت کی بنا پر یہ ذمہ داری صرف وسیع ہو جاتی ہے، متعلقہ اشخاص کے لیے مخصوص نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح کسی کے اندر اگر فہم و بصیرت کی صلاحیتیں معمولی ہوں تو یہ بات اس کی ذمہ داری کو صرف محدود کر دیتی ہے، ساقط نہیں کر دیتی۔ اس لیے کسی بھی فردِ جماعت کا اپنے تئیں یہ گمان کر لینا کہ جماعت کو افکار و اعمال کی خرابیوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری تمام تر اہلِ مناصب اور 'بڑے' لوگوں ہی کی ہے اور ہم جیسے 'معمولی' کارکن اس کے بالکل مکلّف نہیں ہیں۔ ایک خطرناک غلط فکری ہے۔ اس غلط فکری کے ساتھ کوئی شخص اقامتِ دین کی مہم میں صحت مند رویہ اختیار نہیں کر سکتا، اور اگر یہ غلط فہمی عام ہو جائے تو کچھ بعید نہیں کہ تحریک کے لیے موت و حیات کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔

اس فکر و اہتمام اور احتیاطی کوشش کی کامیاب عملی تدبیر صرف یہ ہے کہ پہلے تو قرآن حکیم اور احادیث میں پائی جانے والی متعلقہ اُصولی ہدایتوں کا، نیز پچھلی دینی دعوتوں اور اسلامی

تحریکوں کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، اور اس مطالعہ کی روشنی میں ان وجوہ واسباب کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کرلی جائے جو دعوتوں کے بگاڑ اور زوال کے باعث بنتے آئے ہیں۔ پھر ان وجوہ واسباب کی صرف تشخیص اور توضیح کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرلیا جائے۔ جس طرح کہ ایک ریسرچ اسکالر کیا کرتا ہے۔ بل کہ انھیں تنبیہوں اور عبرتوں کا ایک مرقع، اور اسبابِ زوالِ حق کا ایک آئینہ بنا کر خود اپنے روبرو رکھ لیا جائے، جیسا کہ ایک داعیِ حق کے احساسِ فرض کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ آئینہ جب کبھی کسی فکری یا عملی کجی کی نشان دہی کرے تو اس کجی سے اپنے آپ کو پاک کر لینے میں نہ ایک لمحہ ضائع کیا جائے اور نہ کسی تاویل یا مداہنت یا غفلت سے کام لیا جائے۔

لیکن یاد رہے کہ شیشے کے آئینوں میں اپنے ظاہری خط وخال کا دیکھ لینا جتنا آسان ہوتا ہے الفاظ ومعانی کے اس آئینے میں اپنے اندرون کا دیکھ لینا اتنا آسان نہیں ہوتا ـــــ بل کہ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے، اور اس مشکل پر اس وقت تک قابو نہیں پایا جاسکتا جب تک کہ دو باتوں کا شدّت سے لحاظ نہ رکھ جائے:

ایک تو یہ کہ نفس کی عیّاریوں پر پوری نظر رکھی جائے۔ یہ شاطر نفس اپنے کو غلطیوں اور خطاؤں سے بری ظاہر کرنے میں بڑا حریص بھی واقع ہوا ہے اور بڑا ماہر بھی۔ اس کے پاس پُرفریب تاویلیں تیار کر لینے کی بڑی تیز رفتار مشینیں موجود ہیں۔ نقد واحتساب نے کسی غلطی کی نشان دہی کی نہیں کہ وہ اس طرح کی تاویلوں کا ایک خوش نما پردہ لے کر اس پر ڈال دینے کے لیے لپک پڑتا ہے، اور کم زوریوں کا پتلا انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ نہیں، میں نے کوئی غلطی نہیں کی، فلاں بات جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے وہ کوئی غلطی یا بُرائی نہیں، بل کہ اِن اِن پہلوؤں سے عین حق وصواب تھی ـــــ نفس کے اس کید سے ہوشیار رہنا کام یاب خود احتسابی کے لیے پہلی ضروری شرط ہے۔

دوسری بات یہ کہ فکر وعمل کی کوتاہیوں کے بارے میں ایک خاص اور اہم نکتہ کبھی فراموش نہ ہونے پائے، اور وہ یہ کہ یہ کوتاہیاں بسا اوقات اپنے قالب بدل بھی لیتی ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جن کوتاہیوں نے گزشتہ تحریکوں اور جماعتوں کے اندر ایک خاص شکل اور خاص رنگ میں ظہور کیا ہو، ٹھیک اسی شکل اور اسی رنگ میں اب بھی ظہور کریں۔ شیطان کی یہ ایک بڑی مشہور اور کارگر چال ہے کہ وہ اپنی ''ہدایات'' اور ترغیبات کو ہمیشہ اور ہر شخص کے سامنے ایک

ہی انداز میں پیش نہیں کرتا، بل کہ جدّت سے کام لیتا اور موقع ومحل کو اور انسان کی فکر ونظر کے کم زور پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے، تا کہ ابنِ آدم آسانی سے مات کھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کے خلاف، نفرت اور غصہ ظاہر کرتا ہوتا ہے اسی چیز کو بسا اوقات ایک نئے جامے یا نئے قالب میں پاکر اپنے سینے سے لگالیتا ہے، اور زہر کی محض ایسی ہی گولیوں کو نہیں جن پر شکر چڑھی ہو، بل کہ ایسی گولیوں کو بھی جن کا صرف رنگ ہی شکر جیسا ہو، تریاق سمجھ کر حلق سے نیچے اُتار لیتا ہے۔ نفس اور شیطان کے اس کید سے خبردار رہنا دوسری ضروری شرط ہے۔

ان دونوں ضروری شرطوں کو پورا کرنے کے بعد ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ اپنا صحیح احتساب کرسکیں گے، اور اپنے افکار واعمال کا صحیح عکس دیکھ پائیں گے۔

اسلامی تحریکوں کے لیے اہم ترین خطرے

اب آیئے ان اہم اسباب وعوامل کو معلوم کرلیں جو کسی بھی اسلامی تحریک کے لیے زوال ونا کامی کا خصوصیت سے باعث بن سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نا کامی کے سارے ممکن اسباب کی کوئی قطعی فہرست نہیں بنائی جاسکتی۔ کیوں کہ یہ نہ متعین ہوتے ہیں نہ محدود۔ بل کہ مختلف تحریکوں کے اپنے اپنے مخصوص داخلی اور خارجی حالات کے لحاظ سے رنگارنگ قسم کے ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ہم یہاں صرف انہی خاص قسم کے اسباب وعوامل کا جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور جن کی خطرنا کی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کی طرف سے ہر حال میں اور ہر اسلامی تحریک کو چوکنّا رہنا چاہیے۔

۱- اخلاص اور للّٰہیّت کی کمی

کسی اسلامی تحریک کے اسبابِ زوال میں سب سے نمایاں حیثیت اس مرض کو حاصل ہے جو اس کے کارکنوں کے اخلاص اور للّٰہیّت کو لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرض جتنا ہی زیادہ شدید اور عام ہوتا ہے تحریک اتنی ہی زیادہ زندگی سے دور اور موت سے قریب ہورہتی ہے۔ اگرچہ صرف اسی ایک چیز پر تحریک کا زوال موقوف نہیں ہوتا، بل کہ یہ منجملہ بہت سے اسبابِ زوال کے، صرف ایک سبب ہے، مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر اس کی حیثیت دوسرے تمام اسباب سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ قطعاً ایک جان لیوا مرض ہے، اگر پوری شدّت سے اس کا حملہ ہو جائے تو

کسی تدبیر سے بھی اس کے مہلک اثرات کا ازالہ ممکن نہیں۔ جب کہ دوسرا کوئی بھی سببِ زوال ایسا سمِ قاتل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کے عمل و اثر کی رفتار کو مختلف تدبیروں سے ایک حد تک بہ ہر حال مدھم کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ان دوسرے اسباب وعوامل میں سے بھی کچھ تو ایسے ہیں جن کا شجرۂ نسب بھی بالآخر اسی 'اسی عامل اکبر' سے جا ملتا ہے اور جو دراصل اسی اُمّ الامراض کے انڈے بچّے ہیں، اور باقی کا بھی حال یہ ہے کہ اگرچہ ان کی پیدائش کچھ اور ہی ذہنی اور نفسیاتی کم زوریوں کے بطن سے ہوتی ہے، مگر یہ اخلاص وللّٰہیّت کی کمی ہی ہے جو عموماً انھیں تیزی سے پروان چڑھنے کے لیے ایک سازگار فضا بخشتی اور پھر تحریک پر کاری ضرب لگا سکنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ ان دو وجوہ سے اس چیز کو اسبابِ زوال میں سب سے اہم اور سب سے بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور اسی لیے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کی حقیقت، اس کے عمل اور اس کے حدودِ اثر پر پھیل کر نگاہ ڈالی جائے۔

یہاں ہم نے دو لفظ استعمال کیے ہیں، ایک تو اخلاص کا، دوسرا للّٰہیّت کا۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے مقصد پر دل یک سر مطمئن، اور اس کی خاطر جدوجہد کے لیے ذہن بالکل یک سو ہو۔ دنیا کے کسی اور کام کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، حتیٰ کہ اس کی بابت کچھ سوچا بھی نہ جائے۔ اپنی تمام دوڑ دھوپ اسی کے لیے خاص کر دی جائے، فکر پر وہی چھایا ہوا ہو اور عمل وحرکت کی باگیں تمام تر اسی کے ہاتھوں میں ہوں۔ دوسری کسی چیز سے اگر تعلق ہو تو صرف اسی حد تک جس حد تک کہ خود یہ مقصدِ تحریک اس کا تقاضا کرتا ہو، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اس کی اجازت دیتا ہو۔

للّٰہیت کا مطلب یہ ہے کہ مقصدِ تحریک کے ساتھ یہ تعلق، اور اس تعلق میں یہ اخلاص، صرف اللہ کے لیے اور صرف اسی کی رضا کے لیے ہو۔ اس کی رضا کے سوا نہ کسی اور کی رضا کا دل میں گزر ہو اور نہ اس حقیقی غایت اور اس اعلیٰ مفاد کے سوا اور کوئی غایت اور مفاد نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اپنی ذات اور اپنا خاندان، اپنی قوم اور اپنی ملّت، اپنی پارٹی اور اپنی جماعت، اپنا ملک اور اپنا وطن، پوری انسانیت اور ساری دنیا، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں

ہے جس کی رضا یا جس کا مفاد مقصدِ تحریک سے وابستگی کا اصل محرّک بن سکے۔ اس وابستگی کا حقیقی محرک، اوّل اور آخر، صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی کام یابی کا حصول ہو۔

یہی للّٰہیت وہ خاص جوہر ہے جو کسی تحریک کو 'اسلامی تحریک' بناتا ہے اور اسے دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتا ہے۔ ورنہ جہاں تک مطلق اخلاص کا تعلق ہے وہ تو غیر اسلامی تحریکوں کے لیے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ اسلامی تحریکوں کے لیے۔ اس لیے ایک اسلامی تحریک کو صرف مخلص کارکنوں ہی کی جماعت نہیں چاہیے بل کہ ایسے مخلص کارکنوں کی جماعت چاہیے جن کا اخلاص، للّٰہیت سے ہم دست ہو۔ چناں چہ جب امّتِ مسلمہ کو دین کی اقامت اور حق کی شہادت کے منصب پر مامور کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بات بھی اُسے سُجھا دی گئی تھی کہ یہ کام صرف اللہ کے لیے ہونا چاہیے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

(النساء: ۱۳۵)

''اے ایمان والو! عدل کے علم بردار اور اللہ کے لیے (حق کے) گواہ بنو۔''

اس لیے اقامتِ دین کا یہ کام، جو کسی بھی صحیح اسلامی تحریک کا واحد نصب العین ہوتا ہے، اگر خالصۃً لوجہ اللہ نہ ہوگا تو اس کا جو نام بھی چاہے رکھ دیجیے، مگر قرآنی دعوت یا اسلامی تحریک، اقامتِ دین یا شہادتِ حق کا نام اُسے کسی حال میں نہ دیا جا سکے گا۔ دینُ اللہ کی اقامت کے لیے اخلاص اگر دھڑکتے ہوئے دل کا درجہ رکھتا ہے تو یہ للّٰہیت اس دل کے لیے اس کے اندر گردش کرنے والے خون صالح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے خون سے اگر دل کا جوف خالی ہو تو یقیناً وہ زندگی کا کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔

'اللہ کی رضا' اور 'آخرت کی کام یابی' کے الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو، ان کا مدّعا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اخلاص اور للّٰہیت کے فقدان کے جو بھی نتائج ہوں گے وہ صرف 'اللہ کے پاس' اور 'آخرت ہی میں' سامنے آئیں گے، اس دنیا میں ظاہر نہ ہوں گے۔ بلا شبہ افراد کی انفرادی حیثیتوں کی حد تک تو صورتِ واقعہ یہی ہے، مگر یہ افراد باہم مل کر جو جماعت بناتے ہیں اور یہ جماعت جس تحریک کی علم برداری کرتی ہے، اسے تو ان نامبارک نتائج سے وقت کے وقت اسی دنیا میں

دو چار ہو جانا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ دنیا افراد کے لیے اگر چہ صرف دارالعمل ہے۔ مگر جماعتوں اور تحریکوں کے لیے یہی دارالعمل بھی ہے اور یہی دارالجزاء بھی ہے۔ اس لیے اگر کسی اسلامی تحریک کے افراد کے سینے اخلاص کے سوز اور للّٰہیت کے نور سے بڑی حد تک خالی ہو گئے ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ضروری زادِراہ کے بغیر ہی سفر کر رہی ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب کون سا بیابان اس کے لیے بیابانِ مرگ بن جانے والا ہے۔

نقل ہو یا عقل، ہر ایک کا فیصلہ اسلامی تحریکوں کے انجام کے بارے میں یہی ہے۔ چناں چہ قرآنِ حکیم بار بار یہ حقیقت یاد دلاتا ہے کہ اللہ کے دین کی راہ میں کی جانے والی جدوجہد کی کام یابی کا انحصار تمام تر اللہ کی نصرت پر ہے (وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ) (الانفال:۱۰) اب اگر کوئی نام نہاد اسلامی تحریک بہ حیثیت مجموعی بھی اللہ ہی کے لیے اور اسی کی رضا کی خاطر نہ چل رہی ہو تو پھر اُسے کیا حق ہے کہ وہ اس کے سہارے کی آس رکھے؟ اور کیوں اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل اسے اپنی نصرت کی سزاوار ٹھیرائے؟ اس کی شانِ بے نیازی سے تو اتنی ہی توقع بس ہے کہ وہ اپنے پکارنے والے کی پُکار سُن لے جب وہ اسے سچّے دل سے پکارے، اور جو اس کا ہو رہے اسے اپنی نصرتوں سے نواز دے (قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّىْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ج) (الفرقان:۷۷)

عقلی اور تجرباتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ اخلاص وللّٰہیت سے عاری کسی 'اسلامی' تحریک کو وہ اندرونی یک جہتی کبھی میسّر نہیں آ سکتی جو کسی بھی تحریک کی کام یابی کے لیے لازمی شرط ہے۔ اصل اور حقیقی مدّعا نظروں سے اوجھل ہونے کے باعث اس کے مختلف کارکن، اور کارکنوں کے مختلف حلقے اپنے الگ الگ مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کے نقشے اور طریقے تجویز کریں گے، اور ہر گروہ اپنی ہی پسند کی ہوئی منزل کی طرف پوری تحریک اور جماعت کو کھینچ لے جانا چاہے گا۔ نتیجہ میں فکری وحدت اور عملی ہم آہنگی ناپید ہونے لگے گی اور تحریک کا سفینہ باہمی کش مکش کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر بالآخر غرق ہو رہے گا۔ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے مثالی دعوت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جب تک اس کے علم برداروں میں مخلصین، صادقین اور ''شُهَدَاءَ لِلّٰهِ'' کا عنصر غالب رہا، نصرتِ الٰہی ان کے آگے راہ صاف کرتی اور

کامرانی ان کارکاب تھام کر چلتی رہی، اور اس کے حضور قوموں کی قومیں اپنی عقیدت کی پُر خلوص نذریں پیش کرتی چلی گئیں۔ مگر جوں ہی توازن بدلا اور تحریک کے ان علم برداروں میں ایسے نومسلموں کی ایک بھاری تعداد کا اضافہ ہوگیا جن کا جذبۂ اخلاص وللّٰہیت قابلِ اطمینان نہ تھا، دعوت باہمی اختلاف اور کش مکش کے بھنور میں پھنس گئی، اور اسی وقت سے تاریخ اسلام ایک نیا موڑ مُڑ گئی۔ ماضی قریب کی تحریک، تحریک سیّد احمد شہیدؒ کے پاس کتنے پاک باز، اولوالعزم اور مخلص جاں بازوں کا معیاری سرمایہ تھا! مگر اسی معیاری سرمایہ میں جب سرحد کے کھوٹے سکّے بھی بڑی تعداد میں آ ملے تو ہندستان کے آسمان پر طلوع ہونے والے اسلامی دعوت کے اس روشن ستارے کو اُفق سے بلند ہوتے ہی تاریکیوں نے ڈھک لیا۔

دوسرے عواملِ فساد کے مقابلہ میں اس روحانی مرض کا معاملہ اپنے علاج کے پہلو سے بھی بڑا ہی اہم اور نازک ہے۔ کیوں کہ یہ مرض بالعموم انسان کے لاشعور یا تحت الشعور میں جنم لیتا ہے، اور پھر اسی کمین گاہ میں رہ کر اخلاص وللّٰہیت کی پونجی کو گھُن کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ جس کے باعث اس کا نگہِ احتساب کی گرفت میں آجانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ گہرائیوں تک اُتر جانے والی نظریں بھی اکثر اسے دیکھ پانے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ پھر اگر خوش قسمتی سے کسی طرح اس مرض کی موجودگی کا احساس ہو بھی جائے تو اس کا صحیح صحیح اعتراف کرلینا کچھ آسان نہیں رہتا۔ کیوں کہ ایک تو اس کے لیے ایمانی حِس کی بے داری اور اخلاقی جرأت کی فراوانی درکار ہوتی ہے، دوسرے نوعِ انسانی کا ازلی دشمن اپنی مسلسل جنگ کا سب سے اہم مورچہ مومن کے قلب کو اور اس قلب کے جذبۂ اخلاص وللّٰہیت ہی کو سمجھتا ہے۔ اس لیے اس مورچہ کی جیتی ہوئی کوئی چوکی وہ آسانی سے خالی نہیں کرتا۔ بل کہ اس کے لیے آخر وقت تک گھٹنے ٹیک ٹیک کر لڑتا رہتا ہے، اور اپنا کوئی داؤں استعمال کرنے سے بچا نہیں رکھتا۔ کبھی دین داری کے پندار کو مشتعل کرتا ہے، کبھی نفس کے جھوٹے وقار کو غیرت دلاتا ہے، کبھی خوش نما تاویلوں کی افیون پلاتا ہے، اور اس طرح جی توڑ کوشش کرتا ہے کہ انسان کے اندر کا یہ انگڑائیاں لینے والا احساسِ للّٰہیت پھر غفلت کی نیند سو جائے۔ لہٰذا یہ اللہ کی عطا کی ہوئی خاص توفیق ہی ہے جو انسان کو اپنے اندر کھوٹ کا ٹھیک ٹھیک

اعتراف کر لینے میں کامیاب بنا سکتی ہے۔ اس مرض کے اعتراف کے بعد اب تیسرا مرحلہ اس کے علاج کا آتا ہے جو بہ جائے خود ایک بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے مضبوط ارادے، صحیح تدبیر، مناسب پرہیز اور ایک طویل سعی و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں بسا اوقات ایک لمحہ کی غفلت منزل سے سیکڑوں کوس دُور پھینک دیتی ہے۔ غرض اس راہِ ہفت خواں کا ہر مرحلہ انتہائی دشوار گزار اور صبر آزما ہے۔ لیکن جسے اپنے مقصدِ حیات سے واقعی محبت ہو اور کسی حال میں بھی اس کی بربادی گوارا نہ ہو، اسے خوش دلی کے ساتھ ان سارے مرحلوں کو طے کرنا ہی ہوگا۔

۲- دینی علم و بصیرت کی خامی

دوسرا بڑا عامل، جو کسی اسلامی تحریک کی ناکامی یا زوال کا سبب بنا کرتی ہے، دین کے اصل سرچشموں سے راست رہ نمائی حاصل کرتے رہنے کی عملی صلاحیت سے محرومی کا عامل ہے۔ اس سے بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:

صحیح اجتہادِ[۱] فکر میں اضمحلال اور دینی[۲] بے بصیرتی۔ یعنی اس کے نتیجے میں ایک طرف تو تحریک کے علم برداروں پر فکری جمود اور ذہنی افلاس کا فالج گرتا ہے، دوسری طرف فکری انارکی کا فتنہ پھیلنے لگتا ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کسی تحریک میں زندگی کا نمو اور صحیح سمت پر حرکت و اقدام کی صلاحیت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک اسے فکری اجتہاد کی غذا ملتی رہے اور اصل دینی سرچشموں سے اس کی راست آب یاری کا سلسلہ جاری رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے کارفرما عناصر ان سرچشموں کا راست علم رکھتے ہوں اور ان سے رہ نمائی حاصل کرنے کی ضروری صلاحیت کے حامل ہوں، اور پھر اس صلاحیت سے کام لینا بھی جانتے ہوں۔ اسی کے ساتھ تحریک کے عام افراد بھی دین سے فی الجملہ واقف اور اس کے مزاج شناس ہوں۔ اسلام اور جاہلیت کے کم از کم بنیادی فرق سے بے خبر نہ ہوں، دین کے اصولی افکار و تصورات کا علم رکھتے ہوں، اور خود اپنی حدود کو بھی ٹھیک ٹھیک پہچانتے ہوں۔ لیکن اگر یہ صورتِ حال باقی نہ رہ سکے اور اپنے فرائض اور اپنی حدود کا لحاظ نہ رکھیں۔ خواص کتاب و سنت کو عملاً اپنا اصل رہ نما بنائے

رکھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو جائیں یا صلاحیت رکھنے کے باوجود اس سے کام لینے کی خود اعتمادی سے محروم ہو رہیں، دوسری طرف عوام برخود غلط ہو جائیں، اپنی معمولی اور بالواسطہ دینی معلومات کے بل پر بہ طور خود دین کے تقاضے متعین کرنے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق تحریک کی راہِ عمل مقرر کرنے لگیں، حتیٰ کہ انھیں دیکھ کر اَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا کی حالت پیدا ہو جائے۔ تو ظاہر ہے ایسے دن تحریک کے لیے بڑے ہی نامبارک ہوں گے۔ اُس وقت اس کا حال اس کشتی کا سا ہو جائے گا جس کے ناخدا تو چپّو پھینک کر الگ بیٹھ گئے ہوں اور کشتی کے مسافر اپنے اپنے ہاتھوں کو چپّو بنا کر، جدھر جی چاہتا ہو، کشتی کو بہا لے جانے کے شغل میں مصروف ہوں۔

۳۔ شخصیت پرستی

تیسرا عامل، جو اس دوسرے عامل سے بڑا قریبی رشتہ بھی رکھتا ہے، شخصی عقیدتوں کا غلو ہے، جسے عرفِ عام میں شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے، اور تاریخی شواہد اس مطالعے کی تصدیق کرتے ہیں، کہ اس مرض کا حملہ دینی تحریکوں پر بہت ہوا کرتا ہے، اور جب ہوتا ہے تو بڑا خوف ناک بھی ہوتا ہے۔ شخصیت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے ساتھ لوگوں کا تعلق کسی بڑی شخصیت کی عقیدت کے واسطے سے ہو، اور یہ عقیدت اس تعلق پر غالب ہو، خواہ اس تعلق کی ابتداء ہی اسی انداز سے ہوئی ہو یا بعد میں وہ یہ نوعیت اختیار کر گیا ہو۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی شخصیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جس بات کو بھی صحیح مانتے ہیں اس کی سند کے بعد ہی صحیح مانتے ہیں، وہ اسے سخت بے ادبی سمجھتے ہیں کہ ایسے 'مقدس' شخص کی کسی رائے، کسی فتوے، کسی نظریے کو عقلی اور نقلی دلائل کی ترازو میں تولا جائے، اور تول لینے کے بعد ہی اسے قبول کیا جائے۔ کہنے کو تو وہ بھی کسی غیرِ نبی کی عصمتِ رائے کے قائل نہیں، مگر عملاً کسی بھی ایسے شخص کے بارے میں جس کی عظمت ان کے دلوں پر چھائی ہوئی ہو، یہ سننا پسند نہیں کرتے کہ اس کی فلاں رائے ضعیف ہے، اس لیے لائقِ قبول نہیں۔ عقیدت مندی کا یہ غلو، ایک طرف تو لوگوں سے قوّتِ فیصلہ اور کھرے کھوٹے کی تمیز سلب کر لیتا ہے، دوسری طرف، اس

شخص کے اپنے درمیان سے اُٹھ جانے کے بعد، انھیں حیران و ششدر بنا کر رکھ دیتا ہے، وہ نہیں جان پاتے کہ اب کدھر جائیں اور کیا کریں؟ اُس وقت انھیں تحریک کے مستقبل کی اتنی فکر نہیں رہ جاتی جتنا کہ اس شخصیت سے محرومی کا غم لاحق ہو رہتا ہے۔

بشری نفسیات کا یہ اتنا نازک پہلو ہے کہ ابتدائے اسلام تک میں اس کے بعض مظاہرے دیکھنے میں آچکے ہیں۔ البتہ چوں کہ وہ دورِ سعید ایسا نہ تھا کہ اس میں کسی کی جذباتی بے راہ روی یا فکری کجی کو پنپنے کا موقع مل پاتا۔ اس لیے یہ معمولی شرارے اپنی چمک دکھا کر فوراً بُجھ گئے۔ لیکن یہی بات حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دوران جب ظہور میں آئی تو اپنے آخری نتائج کے ساتھ ظہور میں آئی، یعنی شخصی عقیدت کے غلو کے اِس فتنہ نے یہاں تک رنگ دکھایا کہ بے شمار لوگوں کو جدوجہد کے میدان سے نکال کر عزلت کے گوشوں میں بٹھا دیا۔

پس جب تک کسی تحریک کے کارکنوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی نہ ہو کہ ہمارا حقیقی قائد اور ہمارا رہنما کوئی شخص نہیں سوائے اس شخص کے جس کا نامِ نامی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے ـــــ ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے دلوں کے اندر جب تک یہ حقیقت سرایت کیے ہوئے نہ ہو کہ رضائے الٰہی کے سوا ہماری سعی و جہد کی کوئی غایت مقصود نہیں ـــــ اس وقت تک اس کا حال خطرناک، اور اس کا مستقبل خطرناک تر ہی رہے گا۔

۴۔ تصوّرِ دین کی بے اعتدالی

چوتھا اہم عامل، تصورِ دین کی بے اعتدالی ہے۔ یہ بے اعتدالی کبھی تو علم و بصیرت کی کمی کے باعث خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا سبب خارجی ہوتا ہے۔ یعنی وہ کچھ دوسرے ناقص اور غیر متوازن تصوراتِ دین کے خلاف ردِّ عمل کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ احیائے دین کی کوئی تحریک جس وقت شروع ہوتی ہے وہ لازمی طور پر ایسا وقت ہوتا ہے جب دین کی امانت دار ملت اپنے فرض منصبی سے عملاً غافل ہو چکی ہوتی ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ اس کے سلسلہ میں کوئی قابلِ لحاظ جدوجہد نہیں کر رہی ہوتی۔ اس کے اس رویہ کے پیچھے عموماً دو اسباب کارفرما ہوا کرتے ہیں:

ایک تو یہ کہ ملّت کا احساسِ فرض، زندگی کی تڑپ کھو چکا ہوتا ہے۔
دوسرا یہ کہ اس کا تصورِ دین بھی کسی نہ کسی حد تک ناقص اور غیر متوازن ہو چکا ہوتا ہے۔
اس حالت میں، اور ان اسباب کے پس منظر میں جب کچھ لوگ اللہ کی توفیق پاکر میدانِ عمل میں نکل آتے ہیں اور وہ دینِ حق کے اس پرچم کو اُٹھا لیتے ہیں جو نجانے کب سے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوتا ہے تو فطری طور پر ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ لوگ ہر طرف سے کھینچ کر اس کے نیچے آجائیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے بارے میں تو ان کی یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی ہے، جو ''مسلم'' ہیں اور جن کے نزدیک آج بھی اِس لفظِ مسلم کے معنی بدل کر آخرت فراموش، خدا ناشناس اور خود پرست کے نہیں ہو گئے ہیں، اور جو اُن آیتوں کو بھی، جن میں امّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود صرف حق کی شہادت اور دین کی اقامت بتایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی ویسی ہی آیاتِ الٰہی یقین کرتے ہیں جیسی کہ نماز روزے وغیرہ کا حکم دینے والی آیتوں کو ــــ اس فطری خواہش اور امید کے ساتھ وہ لوگوں کو بُلانے کے لیے گلی گلی منادی کرتے پھرتے ہیں، ایک ایک دروازے کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے ہیں۔ جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک اور عبادت خانوں سے لے کر سیاست گاہوں تک ہر جگہ پُکار آتے ہیں ــــ لیکن اس دوڑ دھوپ کا جو حاصل نکلتا ہے وہ بالعموم ان کی امیدوں اور خواہشوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ وہ بڑے دُکھ اور بڑی حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ دلوں کے دروازے ان کی دعوت کے لیے کھل نہیں رہے ہیں، بل کہ اُلٹے پیشانیوں پر بَل پڑنے لگے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ حیرت کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز تو نہیں پیش کی جارہی ہے جس کی حقانیت، اہمیت اور ضرورت سے ایک مسلمان کو اختلاف ہو سکے، پھر یہ ردّ و انکار کس بنا پر ہے؟ اس سوچ بچار کے سلسلے میں جب وہ لوگوں کے اس رویہ کا ذہنی اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں تو اس کے وہی دو اسباب نظر آتے ہیں جن کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ یعنی احساسِ فرض کی مردنی اور تصورِ دین کی خرابی و بے اعتدالی۔ اس لیے اپنے مقصود و مدّعا کی خاطر وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ان اسبابِ فساد کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ اب پہلی خرابی یا بیماری کے ازالے کے

لیے وہ جو کچھ افہام و تفہیم کرتے ہیں اسے کم از کم سن ضرور لیا جاتا ہے، کبھی تو سرِ ندامت جھکا کر اور اپنی تقصیروں کا اعتراف کرتے ہوئے، اور کبھی ایک سنجیدہ خاموشی کے ساتھ۔ لیکن دوسری خرابی کی اصلاح کا معاملہ اتنا پُر سکون نہیں ثابت ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دینی تصوّرات کی کسی خامی اور بے اعتدالی کا ازالہ اس وقت تک قریب قریب ناممکن ہی ہوتا ہے جب تک کہ ان پر تنقید نہ کی جائے۔ اس لیے چار و ناچار انھیں یہ ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑتا ہے، اور اس وقت تو اس ناگوار فرض کی انجام دہی وقت کی پہلی ضرورت بن جاتی ہے جب یہ بھی دکھائی دے رہا ہو کہ تصوّرِ دین کا یہ بگاڑ نہ صرف یہ کہ لوگوں کے اندر اپنے فرضِ منصبی کے صحیح احساس کو اُبھرنے ہی نہیں دیتا۔ بلکہ بسا اوقات اُبھرے ہوئے احساس کو بھی تھپکیاں دے کر سلا دیتا ہے۔ لیکن افکار و نظریات پر تنقید خواہ کتنی ہی برحق اور محتاط کیوں نہ ہو، عموماً ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی جاتی، پھر تنقید بھی وہ جو عام افکار و نظریات پر نہیں بل کہ لوگوں کے محبوب و مالوف تصوّرات پر کی جائے۔ یہاں تو تنقید کا فقرہ ابھی پورا بھی نہیں ہو پاتا کہ لوگ بھڑک اُٹھتے ہیں اور ہر طرف تحریک کی مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور ضد و عناد کی وہ گرم بازاری ہوتی ہے کہ اس کے مسلمہ بنیادی اُصول و مقاصد تک پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی سامنے سے اور کبھی پیچھے سے۔ کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ۔ قدرتی طور پر تحریک کے کارکن بھی اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چناں چہ ان کے اندر تقریباً ضرور ہی اس کا ایک خاص ردِّ عمل ہوتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ان ناقص تصوّراتِ دین کے خلاف ان کا رویہ اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ صاف دیکھتے ہیں کہ اس صورتِ حال کے ذمہ دار بہت کچھ یہی تصوّرات ہیں۔ یہ دینی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کو بھی تحریک کے پیش کیے ہوئے اُس نصب العین کی طرف آنے نہیں دے رہے ہیں۔ جس کے سوا امّتِ مسلمہ کا کوئی اور مقصدِ وجود ہے ہی نہیں۔ اس لیے اب ان کا فیصلہ بجا طور پر یہ ہوتا ہے کہ ان تصورات پر بھرپور ضرب لگائی جائے۔۔۔ لیکن دوسری طرف یہی وہ نازک وقت ہوتا ہے جب اہلِ تحریک خود بھی تصورِ دین کی ایک جوابی بے اعتدالی کے خطرے کی زد میں آ جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس وقت اس بات کا نہایت قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ ان

کے اس ردِّ عمل میں غیر معمولی شدّت اور غلو پیدا ہو جائے، اور ایک غلطی کے جواب میں لاشعوری طور پر ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس موقع پر صرف وہی لوگ اس غلو سے محفوظ رہ سکتے ہیں جن کو خدا نے اونچے درجہ کی دینی بصیرت، قابلِ اطمینان سلیم الطبعی اور ٹھوس فکری سنجیدگی عطا فرمائی ہو۔ ورنہ تحریک کی مخالفتوں کا ریلا عام لوگوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل دیتا اور اعتدال کی شاہ راہ سے ہٹا کر ایک دوسرے عدم توازن کا شکار بنا دیتا ہے۔ مخالفت کرنے والے اگر کسی دینی مطالبے کو اتنا بلند مقام دینے پر مصر دکھائی دیتے ہیں جو دین میں اس کا فی الواقع ہے نہیں۔ تو وہ اُسے اس کا واجبی مقام بھی دینے پر آمادہ نہیں رہ جاتے۔ اسی طرح اگر وہ کسی چیز کی صحیح دینی اہمیت تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہوں تو یہ اسے اس کے واقعی مرتبے سے بھی بہت اوپر اُٹھا دیتے ہیں۔

مثلاً عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ غیر معتدل ذہنیت کے لوگ اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات میں سے کسی ایک صفت کو اور اس کے تقاضوں کو اس طرح اُبھار دیا کرتے ہیں کہ بعض دوسری صفات کے تقاضے ان کے ذہنوں میں بڑی حد تک دب کر رہ جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے دینی افکار و تصوّرات کا پورا ڈھانچہ لازماً غیر متوازن ہو رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے سابقہ پڑنے پر تحریک کے کارکنوں کا ردِّ عمل یہ رُخ اختیار کر سکتا ہے کہ وہ اِسی صورت حال کا اُلٹ کر خود بھی اختیار کر لیں۔ یعنی دوسری صفات کے جو تقاضے دوسرے لوگوں کے ذہن میں دَب کر رہ گئے ہوں انھیں وہ اس شدّت سے اپنے ذہنوں پر حاوی کر لیں کہ ان کے نیچے اب مذکورہ بالا پہلی صفت کے واقعی تقاضے دب کر رہ جائیں۔

یہ ایک اصولی مثال تھی، اسی پر اسلامی تعلیمات کی ساری باتوں کو قیاس کر لیجیے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کسی جوابی بے اعتدالی کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ دین کی اصل اور مکمل حقیقت اب بھی بہ روئے کار نہ آ سکے گی، اور اس کی حقیقی صورتِ زیبا پر بہ دستور پردہ پڑا رہ جائے گا۔ حالاں کہ دینی تصور کی ہر بے اعتدالی بہ ہر حال بے اعتدالی ہی ہے۔ خواہ اسے کسی تحریک کے علم بردار گروہ نے اختیار کر رکھا ہو یا کسی جمود پرست حلقے نے، اس کے مفاسد سے کسی حال میں بھی

نہیں بچا جا سکتا۔ بل کہ شاید پہلی شکل میں تو یہ مفاسد اور زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ اس لیے کسی غیر متوازن دینی تصوّر کے ساتھ جو جدوجہد کی جائے، اس کو کسی اور معنی میں تو چاہے دینی جدوجہد کہہ لیجیے۔ مگر 'احیائے اسلام' اور 'اقامت دین' کی جدوجہد قرار دینا ہرگز صحیح نہ ہوگا۔ ایسی جدوجہد کا انجام دین کی واقعی اقامت کے نقطۂ نگاہ سے بہ ہر حال ناپسندیدہ ہی نکلے گا۔ ایک طرف تو صحیح دینی فکر و مزاج رکھنے والے لوگوں کے لیے وہ اپنے دروازے از خود بند کر لے گی، دوسری طرف اس کا ہر قدم جو آگے کو اُٹھے گا، اصل شاہ راہ سے کترا کر اُٹھے گا، اور پھر آخر کار وہ امّت کی تاریخ میں افتراق کے ایک نئے باب کا اضافہ کر کے ختم ہو جائے گی۔

۵- گروہی تعصّب

پانچواں اہم عامل ''گروہی تعصب'' ہے۔ انسان کی یہ ایک عام کم زوری ہے کہ وہ جس پیمانہ سے اپنے آپ کو ناپتا ہے، اسی سے دوسروں کو بھی ناپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، وہ اپنے ساتھ حسنِ ظن سے کام لینے میں تو بڑا فیاض ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کے معاملہ میں حد درجہ تنگ نظر بن جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تاویلیں اور رعایتیں، تو سب میرے لیے ہوں اور 'سخت گیریاں' سب کی سب غیروں کے لیے۔ اس جانب داری اور بے انصافی سے وہ اپنے ذاتی معاملہ کے محدود دائرے ہی میں کام نہیں لیتا، بل کہ خاندانی اور قومی، نسلی اور وطنی، گروہی اور جماعتی معاملات کے وسیع دائروں میں بھی وہ اسی مذموم ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے، اور بسا اوقات تو یہاں اس کا ''ذوقِ ستم'' اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں اگر وہ یہ روش اختیار کرتا ہے تب تو ہر طرف سے اس کی مذمّت اور لعنت ملامت ہی ہوتی ہے، حتیٰ کہ خود اس کا اپنا ضمیر بھی، بہ شرطے کہ وہ بالکل ہی مر نہ گیا ہو اندر سے جھٹکے دے دیا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ حق و صداقت کا یہ خون قوم اور ملّت کے نام پر، اور پارٹی اور جماعت کی خاطر کرتا ہے تو اس کے خلاف ایک انگلی بھی نہیں اُٹھتی۔ اس کے برعکس اسے داد و تحسین کے پھولوں سے لاد دیا جاتا ہے، زندہ باد کے نعرے اس کے کانوں میں رس گھولنے لگتے ہیں، اور اسے سر آنکھوں پر بٹھالیا

جاتا ہے۔ رہا اس کا ضمیر، تو تحسین و آفریں کے ان پُر جوش ہنگاموں اور مظاہروں میں اسے بھی جھوٹے اطمینان یا فریب خوردگی کا شکار بن ہی جانا پڑتا ہے۔

نفسِ انسانی کی یہ کم زوری بڑی ہی زبردست اور ساحرانہ قوّت کی مالک ہوتی ہے۔ وہ گروہ بھی، جس نے پاک اور سچّے جذبہ سے کسی اسلامی تحریک کا علم اُٹھایا ہو، اس کے حملوں سے یکسر محفوظ نہیں خیال کیا جاسکتا۔ اسلام کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس گروہی تعصب نے امّت کو بارہا جس طرح پھاڑا ہے۔ آپ آج بھی اس تاریخ کی زبان سے اس کی پوری داستان سن لے سکتے ہیں۔ کتنی ہی دینی تحریکیں تھیں جو حق کی خدمت اور اقامت کے نام اور جذبہ کے ساتھ اُٹھائی گئیں، مگر اسی جاہلی عصبیت کا کرشمہ تھا کہ وہ آخر میں کہیں سے کہیں نکل گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تحریکوں کی ابتداء میں ایمان کا محتسب ساتھ ہوتا ہے۔ اور قرآن کی ترازوئے عدل ہاتھ میں، مگر جب اس موذی مرض کا حملہ ہوتا ہے تو اپنا گروہ اور اپنی جماعت ہی سب کچھ بن جاتی ہے۔ اس کا مفاد حق کا مفاد، اور اس کا دفاع حق کا دفاع قرار پا جاتا ہے۔ اس کا ہر نظریہ اور ہر رویہ اس بات کا مستحق سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب اس پر نظر ڈالی جائے تو انتہائی حسنِ ظن اور احترام سے ڈالی جائے اور اس پر بھی اگر کہیں سے اس میں کوئی نقص نگاہ کے سامنے آہی جائے تو آنکھوں پر جھٹ دونوں ہاتھ رکھ لیے جائیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ہر نظریہ اور ہر رویہ کو سوئے ظن ہی کا حق دار سمجھا جاتا ہے، اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا 'اپنی' جماعت انسانوں کی جماعت نہ ہوئی جن سے صواب کے ساتھ خطا کا بھی امکان ہے بل کہ فرشتوں کا کوئی مقدس گروہ ہے جن کے قریب سے بھی کسی فکری یا عملی لغزش کا گزر نہیں ہوسکتا۔ ظاہر بات ہے کہ حق پسندی اور ہدایت یافتگی کا یہ اجارہ دارانہ تصور بہ جائے خود ایک بڑی گم راہی ہے۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ دل ایمانی خلوص اور للّٰہیت کی حلاوت سے محروم ہیں۔ اس گم راہی اور کج روی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ حمایتِ حق اور ثباتِ ایمانی کا بھیس اختیار کیے ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس میں بلا کی کشش بھی ہوتی ہے۔ انسان کو اس پر کسی ندامت کے بہ جائے اُلٹا ایک طرح کا فخر ہوتا ہے۔

کیوں کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفسِ انسانی کے لیے وہ ضلالت بڑی مرغوب بن جاتی ہے جس پر حقانیت کی نقاب پڑی ہو۔ جو بدنصیب اس آفتِ ایمان جاہلیت کی مضبوط گرفت میں آ جاتا ہے وہ سورج سے بھی زیادہ روشن حق کو، اگر اس کا تعلق کہیں ''باہر'' سے ہو، ٹھکرا دینے میں کوئی تامّل نہیں کرتا، اور علمائے یہود کی طرح دوسروں کو بھی یہ تلقین کرنے لگتا ہے کہ

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ط (آل عمران: ۷۳)

''صرف اسی شخص کی بات مانو جو تمہارے اپنے مذہب کا پیرو ہو۔''

ایسی خطرناک بیماری کا جو گروہ شکار ہو جائے اس سے یہ توقع نِری حماقت ہی ہو گی کہ اس کی کوششوں سے دینِ حق کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔ جن لوگوں کی نگاہ میں جماعتی رشتوں اور جھوٹے گروہی وقار کو یہ مقام حاصل ہو اور جو سچائی کے اعتراف میں 'اپنے' اور 'غیر' کا امتیاز روا رکھتے ہوں وہ دراصل اپنے گروہ کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں، جھوٹ کہتے ہیں اگر کہتے ہیں کہ ان کا مقصد اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے۔ کوئی شخص اپنے خدا اور اپنے گروہ، دونوں کی 'پوجا' ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

۶- آزادیِ رائے کا غلط استعمال

چھٹا اہم عامل آزادیِ فکر و رائے کا غلط استعمال ہے۔ یہ غلط استعمال جب ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو تحریک طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتی ہے، اور طوائف الملوکی وہ بلا ہے جس کی موجودگی میں اس بات کی کوئی امید نہیں رہ جاتی کہ تحریک صحیح رُخ پر ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گی۔ آگے بڑھ سکنے کا کیا سوال، وہ تو اُلٹی پیچھے کی طرف تیزی سے لڑھکنے لگے گی۔ جیسے چڑھائی پر جاتی ہوئی کسی ٹرین کا انجن اس سے کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔

بلاشبہ غور و فکر کی قوت ہی انسان کا امتیازی جوہر ہے۔ اس لیے اس امر میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اس قوت کا استعمال ہر شخص کا پیدائشی حق ہے، جس سے اس کو کسی حال میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اس حق کو از خود استعمال نہیں کرتا وہ فی الواقع اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے، جو دینِ فطرت ہے اپنی

سوجھ بوجھ سے کام لینے کو انسان کے بنیادی حقوق ہی میں نہیں بل کہ اس کے بنیادی فرائض میں بھی شمار کیا ہے۔ وہ اس شخص کو جو عقل وفہم سے کام نہ لے "کَالْاَنْعَام" (جانوروں کے مشابہ) کہتا ہے، اور اس شخص کو جو جانتے بوجھتے بھی حق بات ظاہر کرنے سے کنی کاٹ جائے "شیطان اخرس" (گونگا شیطان) قرار دیتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مقام اس نے عقل وفہم اور آزادیِ فکر و رائے کے صحیح، محتاط اور ذمہ دارانہ استعمال کو دیا ہے، نہ کہ غلط اور بے لگام استعمال کو۔ عقل ورائے کا غلط استعمال تو اس کے یہاں اتنا ہی مذموم ہے جتنا اس کا عدم استعمال مذموم ہے۔ چناں چہ اس نے ایسے وقت کو امّت کے لیے انتہائی بُرا وقت بتایا ہے۔ جب اس کے افراد اپنے حدود بھول کر آزادیِ فکر و رائے کے غیر ذمّہ دارانہ استعمال میں چھوٹ ہو جائیں، ہر شخص اپنی رائے کا پرستار بن جائے اور اس کے نتیجے میں ہر طرف ایک ذہنی انار کی پھوٹ پڑے۔ نبی اکرم ﷺ تنبیہ کے انداز میں فرماتے ہیں کہ:

... حَتّٰی اِذَا رَأَیْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَھَوًی مُتَّبَعًا وَدُنْیَا مُؤْثَرَۃً وَاِعْجَابَ کُلِّ ذِیْ رَاْیٍ بِرَاْیِہٖ وَرَأَیْتَ اَمْرًا لَا بُدَّلَکَ مِنْہُ فَعَلَیْکَ لَنَفْسَکَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَوَامِّ ... الخ

(مشکٰوۃ، باب الامر بالمعروف)

"... یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ بخل کا ہر طرف غلبہ ہے، زمامِ کار نفس کی خواہشوں کے ہاتھ میں ہے، دنیا کو دین پر مقدم رکھا جا رہا ہے اور ہر رائے والا اپنی ہی من مانی رائے پر فریفتہ ہے۔ ساتھ ہی تمھیں یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ تم خود بھی ان میں سے کسی بُرائی میں مبتلا ہو رہے ہو گے تو پھر بس اپنی ہی فکر میں لگ جاؤ اور دوسروں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

خط کشیدہ الفاظ پر ٹھیر کر غور کیجیے۔ ان الفاظ میں بات صرف اتنی ہی نہیں کہی گئی ہے کہ "جب ہر شخص اپنی رائے پر فریفتہ ہو" بل کہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "جب ہر رائے والا اپنی رائے پر فریفتہ ہو۔" گویا یہ صورتِ حال بھی کہ ہر رائے رکھنے والا اپنی ہی رائے پر فریفتہ ہو رہے، ایک مخلص مسلمان کو امر بالمعروف اور اصلاحِ امّت کے معاملہ میں ہمت ہار جانے پر حق بہ جانب قرار

دے دیتی ہے۔ پھر اُس صورتِ حال کا تقاضا کیا کچھ نہ ہوگا۔ جب ہر شخص، خواہ وہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہو یا نہ ہو، ایک رائے ظاہر کر کے اسی پر فریفتہ ہو رہا ہے اور اسی پر اَڑ جانے کا وطیرہ اختیار کر لے۔

یہ تو مرض کی وہ انتہا ہے جس کے علاج کی ہمّت ایک عام انسان کسی حال میں بھی نہیں کر سکتا۔ فکر و رائے کی آزادی کا غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ استعمال کتنا خطرناک فتنہ ہے، اِس حکیمانہ ارشادِ نبویؐ سے اس کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دراصل کسی بھی جماعت کے لیے یہ قطعی ضروری ہے کہ اس کے افراد کے اندر رایوں میں کسر و انکسار کی پوری صلاحیت موجود ہو، کوئی شخص اگر ضروری غور و فکر کے بعد ایک رائے پر پہنچ جائے تو اسے اس بات کا تو پورا حق حاصل ہے کہ وہ مناسب موقع پر اس کو دلائل کے ساتھ پورے زور سے پیش کرے، مگر اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا کہ تمام لوگوں سے اسی کو بہ ہر حال صحیح اور برحق تسلیم کر لینے پر اصرار کرے۔ اس کے بہ خلاف اسے اس امکان کو لازماً سامنے رکھنا چاہیے کہ اس کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اور دوسروں کی صحیح۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی نگاہ زیرِ بحث مسئلہ کے سارے گوشوں پر نہ پہنچ رہی ہو، یا دوسرے لوگ اپنی رائے کے حق میں جو دلیلیں دے رہے ہیں کسی وجہ سے ان کا ٹھیک وزن وہ محسوس نہ کر پا رہا ہو۔ ان تمام امکانات کا لحاظ رکھنے کے باوجود بھی اگر وہ اپنی رائے کے درست ہونے پر آخر وقت تک مطمئن رہے لیکن دوسرے شرکاءِ مشورہ کو اپنی اس رائے سے متاثر و متفق نہ بنا سکے اور کثرتِ رائے سے فیصلہ اس کے خلاف ہو رہا ہو، تو اُسے اب پوری فراخ دلی کے ساتھ اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور عمل کی حد تک اپنی رائے سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ الا آں کہ یہ فیصلہ بالفرض تحریک کے اصول و مقاصد تک کو علانیہ ختم کر دینے والا ہو، اور اس کے سلسلہ میں خدانہ خواستہ اسلام کی منصوص ہدایات تک پسِ پُشت ڈال دی گئی ہوں۔ لیکن جب تک اجتہادی اختلافات ہی کی نوعیت کی ہو۔ اُسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بدستور اپنی رائے پر جما رہے۔ ورنہ اس تحریک اور جماعت کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا جس کے افراد اجتماعی فیصلوں کے مقابلہ میں اپنے ذوق و

رجحان ہی کو نہیں بل کہ اپنی سوچی سمجھی رایوں کو بھی قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہوں ـــــ آخر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس بشر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور صوابدید کو فیصلہ کن سمجھے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپؐ نے بھی کئی بار دوسروں کی رایوں کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کر دی تھی۔ حالاں کہ اگر آپؐ تمام کے تمام صحابہؓ کی متفقہ رایوں کے خلاف بھی کوئی فیصلہ صادر فرما دیتے تو ایک شخص بھی اس کی پیروی سے انکار نہ کرتا۔ پھر کسی زید یا بکر کو اپنی رائے پر ایسے اصرار کا استحقاق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے کہ گویا وہ کوئی انسانی رائے نہیں ہے بل کہ آسمانی وحی ہے جس کے ساتھ تنقید اور انکار کا رویہ اگر اپنایا گیا تو اسلام اور ایمان کا سرشتہ ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

غرض آزادیِ فکر و رائے اور چیز ہے اور رائے پرستی و خود پسندی دوسری چیز۔ آزادیِ فکر و رائے کے صحت مندانہ استعمال کی شکل میں اسلامی تحریک کی ساری توانائی اپنے مقابل محاذ پر ـــــ باطل کے خلاف ـــــ صرف ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ مگر رائے پرستی و خود پسندی کے زہر سے مسموم تحریک و جماعت کی قوتیں پورس کے ہاتھیوں کی طرح خود اپنے ہی مورچہ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں تحریک اپنے ہی ''غازیوں'' کے ہاتھوں ''شہید'' ہو جاتی ہے۔

چناں چہ اُمّت کی تاریخ اِس حقیقت کی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام سے پہلے ہی امّت کے درمیان اختلاف و نزع کی جو تلوار نکل پڑی تھی وہ آج تک نیام میں واپس نہیں جا سکتی ہے۔ اور جو دین وحدتِ فکر و عمل کا نقیب بن کر آیا تھا۔ آج اس کے ماننے والے ستّر بہتّر ٹکڑیوں میں بکھرے پڑے ہیں، تو اس نادیدنی صورتِ حال کا ایک اہم سبب اختلافی امور و مسائل میں یہی رایوں کا بے جا اصرار بھی ہے۔ ہوتے ہوتے یہ ذوق اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اب ثانوی اہمیت کے چند مخصوص افکار و مسائل کی حفاظت ہی شہادتِ حق کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ رائے پرستی کے مریض اشخاص کو عموماً اپنے مریض ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس مرض

ہی کو تندرستی کی سند خیال کر لیتے ہیں۔ انھیں کچھ اس طرح کا وہم ہو جاتا ہے کہ اپنی فلاں رائے یا صوابدید کو چھوڑ دینا گویا استقامت علی الحق کے مقام سے گر جانا ہے۔

رائے پرستی کا یہ مرض جب اِس شدّت کو پہنچ جاتا ہے تو ان کا ایک ایک سانس اختلاف وانتشار کے مہلک جراثیم اگلنے لگتا ہے اور معاشرہ ارجافی فتنوں کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ کہنے کو تو ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کا متحد الاقدام قافلہ، مگر حقیقت میں الگ الگ وادیوں میں بھٹکنے والے مسافروں کی الگ الگ ٹولیاں، اور ہر ٹولی، "کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ" کی مصداق ـــــ یقیناً ایسی خوف ناک ذہنیت اور کج روی سے ہر اس تحریک کو ہزار بار اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے، جو اللہ کے دین کو ازسرِ نو زندہ کرنے اور اسے کتاب وسنّت کے اوراق سے لے کر زندگی کے پھیلے ہوئے میدان میں اس کی پوری روح اور مکمل ہیئت کے ساتھ برپا کر دینا چاہتی ہو۔
